تعلیم

اقبال

کا

فلسفۂ تعلیم

پروفیسر کرم حیدری

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.

"ہماری تعلیم دماغی ترقی کے لیے کوئی ذریعہ مُہیا نہیں کرتی اور نہ وسیع النظر بناتی ہے۔ ہر علم کی تعلیم اس قدر ناقص دی جاتی ہے کہ علم سے متعارف بھی نہیں ہو سکتے۔ روحانیت کی طرف ترغیب تو کیا ہوتی مذہب ہم سے دُور ہو جاتا ہے۔"

اقبال

برصغیر پاک و ہند میں جتنا کچھ اقبال اور اُس کے کلام و پیام کے متعلق لکھا گیا ہے اتنا شاید ہی آج تک کسی اور فرد واحد کے بارے میں لکھا گیا ہو لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جو کچھ اقبال کے متعلق لکھا گیا ہے، اُس کی شخصیت، اُس کا فن، اُس کا پیغام اس سے کہیں زیادہ لکھے جانے کے متقاضی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لکھنے والوں نے محض سطح پر اٹھنے والی لہروں کا مشاہدہ کر کے اپنے اپنے قیاس کے مطابق اُس بحرِ ذخّار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو اُن اوپری لہروں کے نیچے اپنے دامن میں علم و حکمت کے بے بہا موتی سمیٹے ہوئے ایک ابدی کشمکش میں مصروف ہے۔ اور جس طرح معمولی روشنی کی شعاعیں سمندر کی تہہ تک پہنچنے میں ہماری رہنمائی نہیں کر سکتیں اسی طرح اقبال کے کلام کی تہہ تک پہنچنے میں محض علمِ ظاہر ہماری کامیاب معاونت نہیں کر سکتا۔

اقبال کے متعلق لکھنے والوں نے سب سے زیادہ اُس کے فلسفۂ خودی کی توضیح و تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ لوگوں نے زمان و مکان سے متعلق اُس کے تصورات پر بھی بحث کی ہے لیکن تصورِ زمان و مکان چونکہ خالصتاً علمی اور فلسفیانہ موضوع ہے اس لیے بحث کرنے والوں نے عام طور پر اس میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اقبال کی عام اصطلاحات مثلاً مردِ مومن، قلندر، سکندر، حکیم، کلیم، شاہین، عقاب وغیرہ پر بھی لوگوں نے بہت کچھ زورِ قلم صرف کیا ہے اور اُس کے فوق البشر کے متعلق بھی طویل بحثیں کی ہیں مگر جس پہلو پر سب سے کم توجہ صرف کی گئی ہے، وہ اُس کا فلسفۂ تعلیم ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اقبال کے متعلق خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی ایک فاضلانہ

تصنیف "فکرِ اقبال" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ان بزرگوں میں سے ایک تھے جنہیں اقبال کے ساتھ بیٹھنے کے مواقع بکثرت نصیب ہوئے۔ وہ خود بھی ایک فلسفی تھے اور ایک نامور ماہرِ تعلیم بھی۔ توقع تھی کہ اُن کے ہاں اِس موضوع پر بہت کچھ ملے گا لیکن انہوں نے بھی اقبال کے نظریۂ تعلیم پر کھُل کر بحث نہیں کی۔ کہیں کہیں محض اشارات دیئے ہیں۔[۱] اُسی زمانے میں ایک کتاب "نقوشِ اقبال" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی[۲] جو آقائے رازی اور علامہ عرشی کے مقالات پر مشتمل تھی۔ آقائے رازی گورنمنٹ کالج لاہور میں ادبیاتِ فارسی کے پروفیسر تھے اس لیے تعلیم سے براہِ راست متعلق تھے لیکن اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے بارے میں وہ بھی خاموش ہیں۔ اقبال کے فکر و فن کے متعلق ایک نہایت عمدہ، گراں بہا اور قابلِ قدر تصنیف ڈاکٹر یوسف حسین خان کی "روحِ اقبال" ہے جو اپنے اعلیٰ معیارِ تنقید کی بنا پر برصغیر کے تمام علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب میں "اقبال اور آرٹ"، "اقبال کا فلسفۂ تمدن"، "اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات" اور "تقدیر اور زمان" اور "مسئلۂ جبر و قدر" کے بنیادی موضوعات کے تحت بہت سے ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً 'آرٹ اور زندگی'، 'مقاصدِ آفرینش'، 'قصۂ آدم'، 'اجتماعی خودی'، 'حیاتِ اجتماعی'، 'مملکت اور تمدن'، 'نظامِ معاشری'، 'خودی اور خدا' وغیرہ۔ لیکن تعلیم کے بارے میں کوئی ذیلی عنوان نہیں ہے۔

نظریۂ تعلیم سے ناقدین کے اِس عمومی صرفِ نظر کے لیے ہم اُن پر کوئی الزام بھی نہیں دھر سکتے کیونکہ اقبال نے خود تعلیم کے متعلق براہِ راست بہت کم کہا ہے۔ نظم کے علاوہ اُس کی نثر خصوصاً "تشکیلِ جدید فکرِ اسلامی" میں بھی تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کے بارے میں بہت ہی کم مواد ملتا ہے۔ لہٰذا ہر ناقد کی نظر اُن موضوعات کی طرف اٹھی ہے جن پر انہوں نے بہت کچھ کہا مثلاً فلسفۂ خودی، زمان و مکان، ایمان، ایقان، حیاتِ اجتماعی وغیرہ

اگر ہم اس امر کو تسلیم کر لیں کہ اقبال ایک فلسفۂ حیات کے داعی تھے اور نظری اختلافات کے لیے تمام تر گنجائش کے باوجود یہ فلسفۂ حیات جامع اور مکمل ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ تعلیم و تربیت کے بارے میں بھی اُن کے خیالات واضح اور مکمل تھے کیونکہ کوئی فلسفۂ حیات بھی تعلیم و تربیت جیسے اہم اور بنیادی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اور ہر چند کہ اقبال نے اپنی گراں مایہ تصانیف میں فلسفۂ تعلیم کو اس تفصیل سے بیان نہیں کیا جس تفصیل سے ایک ماہرِ تعلیم کو بیان

کرنا چاہیے۔ پھر بھی ہمیں اُن کے کلام میں اس تفصیل کے اجمالی خاکے جو اپنی جگہ بالکل واضح ہیں ضرور ملتے ہیں۔[۱] ایک فلسفی اور شاعر سے اجمالی خاکوں سے زیادہ کی توقع بھی نہ رکھنی چاہیئے ان خاکوں میں رنگ بھرنا اُن ماہرینِ تعلیم کا کام ہے جو تعلیم و تربیت کے اہم قومی اور ملکی مسئلے کے تمام عملی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور جن کا فریضۂ منصبی یہ ہے کہ اِس بنیاد پر ملت کی تعمیرِ و تشکیل کریں نیز اس طرح سے اپنے فلسفی شاعر کے پیش کیے ہوئے اجمالی خاکوں میں تفصیل کا رنگ بھریں اور اس طرح ایک ایسا نظامِ تعلیم مرتب کریں جو قومی ضرورتوں اور ملّی امنگوں کو مناسب پیش رفت عطا کرے۔[۲]

سترہویں صدی عیسوی میں یورپی اقوام نے اپنے ملکوں سے نکل کر تجارت اور تسخیرِ ممالک کے میدان میں قدم بڑھانے شروع کیے۔ نئی دنیا کی دریافت اور وہاں سے بے پناہ ذخائرِ دولت کی درآمد نے اُن کے سینوں میں نئے نئے ولولے اور نئی نئی امنگیں پیدا کیں۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک یہ اقوام ترقی کی کئی منازل طے کر چکی تھیں۔ سائنسدانوں کی نت نئی ایجادات اور سائنس کی پیش قدمی نے اہلِ یورپ کے ذہنی افق میں بڑی وسعت پیدا کر دی تھی۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کا احساس ہو چکا تھا یا اقبال کے الفاظ میں ان کی خودی بیدار ہو چکی تھی اور وہ ان صلاحیتوں کو بطریقِ احسن بروئے کار لا رہے تھے۔ اِدھر ایشیا اور افریقہ میں جہاں بیشتر علاقوں میں مسلمانوں کو عددی تفوق حاصل تھا اور نیل کے ساحل سے لے کر خاکِ کاشغر تک اور طرابلس الغرب کے میدانوں سے لے کر ملایا اور انڈونیشیا کے سبزہ زاروں تک تہذیبی تفوق کے مالک بھی وہی تھے، اُن کی اقبال مندی کا سورج ڈھل رہا تھا۔ مسلمان اپنی بارہ سو سالہ جدوجہد کی زندگی کے بعد گویا تھک کر سستا رہے تھے۔ تاریخِ انسانی کے سٹیج پر ایک طویل عرصے تک نمایاں ترین کردار ادا کرتے رہنے کے نتیجے میں ان کے قوائے ذہنی و جسمانی انحطاط پذیر ہو رہے تھے۔ وہ سیلِ بے کراں جو کسی زمانے میں تمام بلندیوں اور پستیوں کو روند چکا تھا بلکہ یوں کہیے کہ بلند و پست کو ایک کر چکا تھا، اب چھوٹی چھوٹی ندیوں میں بٹ کر محض سبک رو نغمے بکھیرنے پر قناعت کیے ہوئے تھا۔ دیارِ مغرب میں عظمت و اقبال کا سورج نصف النہار پر تھا اور ارضِ مشرق پر شام کے دھندلکے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ سرزمینِ ہند جو ایران کے بعد اسلامی تہذیب و تمدن کی سب سے بڑی جولانگاہ تھی، وہاں مسلمانوں کی قوتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ شمشیر و سناں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور طاؤس و رباب کا دور دورہ تھا۔ طاؤس و رباب کے

نغموں میں وہ ہمہ گیری اور بلند آہنگی مفقود ہوتی جارہی تھی جو دو صدیاں پہلے مغل دربار کا طرۂ امتیاز تھی اور جس کی گونج وسط ایشیا اور مشرقِ قریب سے گزر کر ڈینیوب کے کناروں بلکہ اطلانتک کے سواحل تک سنی جاتی تھی۔

ان حالات میں یورپی اقوام اور ہندی مسلمانوں میں تصادم ہوا۔ یہ تصادم دو فوجی قوتوں یا دو حکومتوں کا نہ تھا، دو تہذیبوں کا تھا۔ ایک تہذیب اپنی اٹھان پر تھی اور دوسری انحطاط کے مراحل طے کر رہی تھی۔ ایک برفانی پہاڑوں سے پھوٹنے والا تند و تیز دریا تھا، دوسری تپتے ہوئے میدانوں میں نرم و گرم ریت کی آغوش میں سوتی ہوئی ندی۔ ایک کو اپنے پھیلاؤ کے سامنے شش دانگ عالم کی وسعتیں تنگ نظر آ رہی تھیں اور دوسری پر اپنے گھر کی چار دیواری تنگ ہو رہی تھی۔ اس کش مکش کا نتیجہ وہی ہوا جو تاریخی عوامل اور جدلیاتی اصولوں کے اعتبار سے ہونا چاہیے تھا۔ مسلمانوں کی قوت و حشمت کی بساط اُلٹ گئی اور وہ چراغ جسے خواجہ معین الدین اجمیریؒ، سید علی ہجویریؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ جیسے بزرگوں نے اپنے نفسِ گرم سے روشن کیا تھا اور جسے ایک ہزار سال تک افغانوں، ترکوں، مغلوں اور دوسرے مسلمانوں نے اپنے خون سے روشن کیے رکھا تھا، لال قلعہ کے مرمریں طاقوں میں گل ہو کے رہ گیا۔ اس کے بجھنے سے مسلمانوں کے دل و دماغ پر یک لخت یاس و اندوہ کی ظلمتیں چھا گئیں۔ آخری دور میں چند کرنوں نے کاویری، ہگلی، جمنا اور سندھ کے کنارے افقِ مغرب سے آنے والی تاریکیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن بادِ مخالف کچھ اس شدت سے چل رہی تھی کہ

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتہ است (غالب)

کا سماں تھا۔

زوال و انحطاط کے اس دور میں مسلمانوں کے اندر دو مکاتبِ فکر کام کرنے لگے۔ ایک مکتبِ فکر وہ تھا جس کی داغ بیل شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادۂ پاک نے ڈالی تھی۔ دوسرا مکتبِ فکر، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد وجود میں آیا۔ اس کی بنیاد رکھنے والے سید احمد خان تھے[۵]

شاہ ولی اللہ کا مکتبِ فکر جد و جہد یعنی زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز کا علم بردار تھا۔

اس مکتب فکر کا مرکزی نقطۂ نگاہ جہاد تھا اور جہاد بھی بالسیف۔ اس مکتبِ فکر کے پیروفکر و اسلام میں کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ وہ راہِ خدا میں سر کٹانا اور گھر لٹانا جانتے تھے۔ دشمنانِ دین سے براہِ راست ٹکرانا اور شکست پر شکست کھا کر بھی ہار نہ ماننا اُن کا مسلک تھا۔ وہ اپنے سر کو جو خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے جھکتا تھا، کسی اور دروازے پر جھکانے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ فتح یا موت کے قائل تھے۔ درمیانی راستہ چاہے کتنا ہی دلفریب اور پُرکشش ہو انہیں قبول نہ تھا۔

مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ہی اس تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم تحریک کے سربراہ ہندی مسلمانوں کے انجام کا اندازہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کر چکے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کے ساتھ ہندی مسلمانوں کے پے در پے تصادم ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک یہ تحریک دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور دوستوں کی کج فہمیوں کے باعث کئی زخم کھا چکی تھی۔ انگریز حکومت سیاسی و عسکری ہر دو محاذوں پر اہلِ ہند سے کہیں زیادہ برتر تھی۔ تاہم برطانویوں نے عسکری محاذ پر مسلمانوں کا زور توڑنے کے ساتھ ساتھ علمی اور تہذیبی محاذ پر بھی اُن کی شکست و ریخت کے انتظامات کر لیے تھے۔ شکست و ریخت کے اس عمل کو یقینی بنانے کے لیے انہوں نے طریقۂ تعلیم کو بدل ڈالا۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے جو گورنر جنرل کا ایک مشیر تھا، فارسی کی جگہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے گورنر جنرل کی کونسل میں ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک ریزولیوشن منظور کرایا جس کی رُو سے برطانوی ہند کی سرکاری زبان انگریزی ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کے سانحۂ عظیم کے بعد تو مسلمانانِ ہند کو اپنی ہستی ہی خطرے میں نظر آنے لگی۔ انگریزوں کی نگاہ میں ہر مسلمان سرکش اور باغی تھا اس لیے اس کی سرکوبی لازمی تھی۔ اس پُر آشوب دور میں سر سید احمد خان ایک عزم مجاہدانہ لیے ہوئے آگے بڑھے اور نہ صرف مسلمانوں کی کشتیٔ حیات کو نذرِ طوفان ہونے سے بچا لیا بلکہ اُن کے سامنے زندگی کا ایک نیا لائحہ عمل بھی پیش کیا۔

سر سید احمد خان کی تحریک حقیقت پسندی پر مبنی تھی۔ وہ جان چکے تھے کہ ہر قوم کے لیے اجل یعنی ایک میعادِ عمل ہے۔ فرمانِ خداوندی کے مطابق اس برعظیم میں مسلمانوں کی حاکمیت کی زندگی ختم ہو چکی ہے نیا سورج ابھر رہا ہے اس لیے ڈوبتے ہوئے تاروں کا ماتم کرتے رہنے یا آنکھیں موند کر نئے سورج سے انکار کرتے رہنے سے کچھ نہ بنے گا۔ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ اس نئے سورج کی تابانیوں سے استفادہ کیا جائے۔ اپنی کمزوریوں کا محاسبہ کیا جائے۔

اور نئے زمانے کی تابانیوں کو اپنے قومی وجود میں سمو لینے کی جد وجہد کی جائے۔ اس مکتبِ فکر کی بنیاد سمجھوتے پر تھی۔ مشرق و مغرب میں سمجھوتہ، قدیم اور جدید میں سمجھوتہ اور زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز کا اصول۔ جو لوگ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر گہری نظر نہ رکھتے تھے، جو دماغ کی بجائے دل، معنی کی جگہ لفظ اور غور و فکر کے بدلے جذبات سے کام لینے کے عادی تھے انہیں سمجھوتے کی یہ تحریک ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے صرف موافقت نہ کرنے پر بس نہ کی، عملی مخالفت بھی کی۔ لیکن سمجھوتے کی اس تحریک کو کامیاب ہونا تھا، سو ہوئی، کیونکہ واقعات و حالات کا ظہور تاریخی عوامل کے تابع ہوتا ہے اور جس دور میں تاریخی عوامل کا جو تقاضا ہوتا ہے، حالات و واقعات اُسی نہج پر چل نکلتے ہیں اور وہ شخصیتیں بھی جو ہمیں حالات و واقعات کا رخ موڑتی ہوئی نظر آتی ہیں، درحقیقت انہی تاریخی عوامل کے زیرِ اثر نشوونما حاصل کرتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر تک مسلمان سمجھوتے کی اس تحریک کی طرف پوری طرح مائل ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اس نئے دور کے لیے مغربی علوم اور کسی حد تک مغربی طرزِ معاشرت کو بھی اپنا لیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں یہ کہنا غیر ضروری نہ ہو گا کہ دنیائے اسلام میں صرف ہندی مسلمان ہی ایسے تھے جنہوں نے مغربی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنی ملی اور قومی خصوصیات کو برقرار رکھا تھا۔ حالانکہ استیلائے مغرب کی زد سب سے زیادہ انہی پر پڑی تھی۔ اب مسلمان طلباء نہ صرف اندرونِ ملک انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے لگ گئے تھے بلکہ سیکڑوں نوجوانوں نے خود انگلستان کی یونیورسٹیوں میں جا کر ان علوم کی تکمیل کی۔ انہی نوجوانوں میں بہت سے ایسے نکلے جنہوں نے آگے چل کر ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ فکر و نظر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ انہی میں سے ایک اقبال بھی تھے جن کا اثر غالباً سب سے گہرا اور سب سے زیادہ دور رس ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا چلا جائے گا، یہ اثر زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔

بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں انگریزی استعمار کے سب سے بڑے حریف اور سب سے بڑے دشمن جنہوں نے اس استعمار کا مقابلہ کیا اور بالآخر اسے ختم کر کے دم لیا، وہی لوگ تھے، جنہوں نے سرزمینِ انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ اُس ملک میں بسر کیا تھا لیکن درحقیقت یہ چیز اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ ہر خلیل کسی آزر کے گھر میں اور ہر موسیٰ کسی فرعون کے ہاں نشوونما پایا کرتا ہے۔ جن لوگوں نے انگریزوں کے درمیان رہ کر اُن کی زندگی اور معاشرے کا نہایت قریب سے مطالعہ کیا، وہی

اس طلسم سے آزاد ہوئے جو سات ہزار میل کی دوری کے باعث عام ہندوستانیوں کی آنکھوں کے سامنے ایک نظر فریب پردہ بنا ہوا تھا۔ اُن پر دانشِ مغرب کی تمام حقیقت فاش ہو گئی اور انہیں احساس ہو گیا کہ اپنی تمام ظاہری چمک دمک کے باوجود یہ دانش نوعِ بشر کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں۔ اقبال اسی بنا پر فرماتے ہیں

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ
مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں — کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیلؐ

عذابِ دانشِ حاضر آج سے باخبر ہونے کے بعد اپنے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں کو اس عذاب کی ماہیت سے باخبر کرنا اور اس عذاب سے بچانے کی کوشش کرنا، اقبال کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار پا گیا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔ ان کی تمام عمر مغربی استعمار کے خلاف لڑتے لڑتے گزر گئی۔ اس استعمار نے انہیں اپنے ارادوں سے باز رکھنے کے لیے طرح طرح کے دام بھی پھیلائے لیکن وہ مرغِ بلند آشیاں جو فطرت سے عالی ہمتی کا جوہر لے کر آیا تھا وہ اس دام میں کہاں آنے والا تھا اس نے اپنے ہم صفیروں کو بھی آگاہ کیا۔

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و علوم کا جن کی تمام تر بنیاد مادیت پر تھی بغور مطالعہ کرنے اور مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے جن کی بنیاد روحانیت پر تھی، مقابلہ اور موازنہ کرنے کے بعد اقبال نے اقوامِ مشرق کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص ایک عملی فلسفۂ حیات پیش کیا۔ یہ فلسفۂ حیات شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتبِ فکر اور سرسید احمد خان کے مکتبِ فکر کے بین بین اعتدال کا راستہ تھا

مختصراً اس کی خصوصیات یہ تھیں۔

۱۔ مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف بغاوت
۲۔ اہلِ مغرب کی استعماریت کے خلاف عملی جد و جہد
۳۔ مغربی علوم سے بقدرِ ضرورت و ہمت استفادہ

شاہ ولی اللہ کے مکتبِ فکر کے پیرو مغربیت سے قطعاً نفرت کرتے تھے یہاں تک کہ

ان کے نزدیک انگریزی زبان کا پڑھنا پڑھانا بھی غلط بلکہ ناجائز تھا۔ سرسید سکول کے حامی نہ صرف انگریزی زبان اور یورپی علوم و فنون کے حصول کو اپنی ترقی کے لیے لازمی خیال کرتے تھے بلکہ یورپ کی مادی ترقی سے مرعوب ہو کر یورپی تہذیب و تمدن کی برتری کے بھی قائل تھے۔ یہ دونوں راستے اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ یورپی علوم و فنون کی حیثیت اپنی جگہ مسلّم تھی لیکن احساسِ کمتری سے اس تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال دینا بھی غلط تھا۔ خدا نے علم و حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے چنانچہ اقبال نے اسی خدائی فرمان کو یاد دلاتے ہوئے مسلمانوں سے کہا ہے۔

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر[۸]

اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات واضح ہیں۔ جب آپؐ حکمت کو مومن کی گمشدہ متاع[۹] کہتے ہیں اور چین تک جا کر علم حاصل کرنے کی تلقین فرماتے ہیں[۱۰] تو اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیوی اور سائنسی علوم کو بھی اُسی ذوق و شوق سے حاصل کیا جائے جس ذوق و شوق سے دینی علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاہم یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں حصولِ علم انسانیت کے بہت بڑے مقاصد میں سے ایک ہے۔ وہاں یہ مسئلہ نہایت الجھا ہوا بھی ہے علم نور بھی ہے اور حجاب بھی[۱۱]۔ العلم حجاب الاکبر ایک بہت بڑی اور ٹھوس حقیقت ہے۔ عام طور پر لوگ خصوصاً ناپختہ کار نوجوان دوسری اقوام کے علوم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر ان کے وہ اصولِ حیات بھی اپنانے چلے جاتے ہیں جو انہیں [illegible] میں مبتلا کر کے دوسری صدی کا صید زبوں بنا دیتے ہیں۔

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

صید زبوں بن جانے کی وجہ پیر رومی کی زبانی سنیے

مرغِ پر نارستہ چوں پرّاں شود
طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود

چنانچہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ مرغانِ پر نارستہ جب مغرب کی علمی فضاؤں میں اڑتے ہیں تو اکثر و بیشتر گربۂ تہذیب کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس طرزِ معاشرت، طریقِ رفتار و گفتار، لباس اور چال ڈھال ہی کو قوت و عظمت کی اساس

سمجھنے لگتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں مشرقی اقوام نے جس تیزی سے مغربی رسوم و عادات کو اپنایا، وہ اسی مرعوبیت اور احساس کمتری کی دلیل ہے۔ اقبال انہیں آگاہ کرتے ہیں کہ

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ رُوست
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است [۱]
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی مشرقی اقوام نے اور بدقسمتی سے زیادہ تر مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ قریب کے مسلمانوں نے چنگ و رباب، رقص و سرود، ساقِ عریاں اور قطعِ موی کو ترقی اور تمدن کی بنیاد سمجھ لیا۔ یہاں تک کہ ترکوں نے اپنی سات سو سالہ علمی اور ثقافتی روایات سے قطع تعلق کر کے خطِ لاطینی بھی اختیار کر لیا اور علم و فن بالخصوص سائنسی علوم و فنون کی طرف وہ توجہ نہ دی جو اہلِ مغرب کی حقیقی ترقی کا سبب تھیں۔ اس شعر میں اقوامِ مشرق کی نقالی اور کورانہ تقلید پر کتنا بھرپور طنز ہے۔

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست (جاوید نامہ)

علم و ہنر جہاں قطع و برید جامہ کا مرہونِ منت نہیں اور عمامہ مانعِ علم و ہنر نہیں ہو سکتا وہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ علم کی دو بڑی شاخیں ہیں ایک علمِ طاغوتی اور دوسری علمِ لاہوتی۔ طاغوتی علم وہ ہے جو انسان کو تمرد اور سرکشی سکھاتا ہے اور لاہوتی علم وہ ہے جو اُسے اس راستے سے بچاتا ہے۔ طاغوتی علم کی بدولت جب انسان اپنی معمولی سی صلاحیتوں کا مشاہدہ بھی کرتا ہے تو فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہے اور بے اختیار "اَنَا وَلَا غَیْرِی" کا نعرہ بلند کرتا ہے اور جس طرح رات کی تاریکی میں کسی ویرانے میں چمکنے والا تنہا جگنو یہ سمجھتا ہے کہ فضائے بسیط میں صرف وہی روشنی کا منبع ہے، اُسی طرح آدمی اِس زعمِ باطل کا اسیر ہو

ہو جاتا ہے کہ تمام کائنات میں وہی وہ ہے۔ یہ لادینی خرد جوں جوں زیادہ پختہ کار ہوتی جاتی ہے توں توں اس کے اسیر اپنے ہی ابنائے جنس کی ہلاکت و بربادی کے سامان مہیا کرتے ہیں اور جیسے جیسے ہلاکت اور بربادی کے سامان زیادہ ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے انسان انانیت کے نشے میں اور زیادہ مدہوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی علم کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔

علم را بے سوز دل خوانی شر است
نور او تاریکیٔ بحر و بر است
عالمے از غاز او کور و کبود
فرودینش برگ ریز ہست و بود
بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ
از بم طیارۂ او داغ داغ
علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں (جاوید نامہ)

یعنی علم ہو لیکن باعشق ہو۔ اس کا پس منظر دینی اور بنیاد روحانیت پر ہو۔ اس کا مقصد بنی نوع انسان کی خیر و فلاح ہو۔ علم و دانش کو اگر ہم ایک پھول کھلانے والا سدا بہار پودا سمجھیں تو اس پودے کے لیے ذہن کی زمین بھی ایسی ہونی چاہیے جس میں یہ پودا تر و تازہ رہ سکے اور اس کے ساتھ وہی پھول لگیں جو ذہنی اور روحانی کثافتوں کو دور کر سکیں۔ اگر ہمارے ذہن کی زمین میں ایمان و ایقان کی بجائے کفر و الحاد کی مٹی ہو گی تو پھول بھی وہی کھلیں گے جو دیکھنے میں تر و تازہ اور خوش رنگ ہوں گے اور ان میں خوشبوئیں بھی ہوں گی لیکن یہ تر و تازگی ہمیں فریب نظر میں مبتلا کر دے گی جبکہ خوشبوؤں میں ایسا زہر ہو گا جو انسانیت کے جوہر لطیف کو ماؤف کر دے گا۔

اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا مدرسے اور مکتب کو نشانہ بنایا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں ان دانش کدوں سے خواہ مخواہ کی کد ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان میں جو علم و ہنر جوانوں کو سکھایا جاتا ہے، وہ سوزِ عشق سے خالی ہوتا ہے۔ اس علم سے دماغ تو منور ہو جاتے ہیں لیکن دلوں میں سوز و ساز پیدا نہیں ہوتا۔ یہ علم گویا عصرِ حاضر کی برقی قوت کی طرح ہے کہ اس

کی لہر سے انسان کا گھر تو روشن ہو جاتا ہے لیکن اس کے ایک جھٹکے سے وہ ابدی نیند بھی سو سکتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مدرسہ و مکتب میں نئی نسل کا گلا گھونٹا جا رہا ہے اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی صدا جو مسلمان کے جسم میں روح کا مرتبہ رکھتی ہے، کہیں سنائی نہیں دیتی۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

سوز و گداز کی اس بنیادی کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم کے جوہر تابناک سے مستفید ہونے کے باوجود اپنے اندر وہ اطمینان محسوس نہیں کرتا جو اسے علم حاصل کرنے کے بعد خود بخود مل جانا چاہیئے۔ اطمینان تو درکنار، حقیقتاً جتنا وہ علم کے میدان میں آگے بڑھتا ہے اتنا ہی اس کے دل کے اضطراب اور روح کی پیاس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ حکمت کے پیچ و خم اسے زیادہ الجھائے چلے جاتے ہیں۔ وہ راہِ علم کا ایسا مسافر ہوتا ہے جسے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور وہ "فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّہِیْمُوْنَ" کے مصداق مختلف اطراف و جوانب میں بھٹکتا رہتا ہے

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

ایسا علم بجائے اس کے کہ انسان کو کمالِ انسانیت کی طرف لے جائے، اسے گمراہیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔[۱۳] مغرب میں اسی علم نے ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں مرد اپنی مردانہ صفات اور عورت اپنی عورت پن سے محروم ہو گئی۔ انسانوں کے دلوں میں سے محبت کے وہ لطیف جذبات جو مختلف افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتے ہیں جو مرد اور عورت کو ایک پاک جذبے کے تحت ایک خاندان کی بنیاد رکھنے پر آمادہ رکھتے ہیں یکسر معدوم ہو گئے اور آج مغرب میں عائلی زندگی تقریباً تباہ ہو چکی ہے۔ کنبہ یا خاندان جو معاشرے میں ایک مضبوط اکائی کی حیثیت رکھتا ہے، تقریباً ختم ہو چکا ہے اور پھر عائلی زندگی کے اس طرح درہم برہم ہو جانے سے اقوام میں اخلاقی انارکی پھیل گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک علم مغرب

کا ایک دردناک المیہ یہ ہے کہ اس نے عورت کو جذبۂ امومت سے بیگانہ کر دیا ہے۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

عورتوں کی تعلیم جو اقبال کے زمانے میں مروج ہو رہی تھی اُس کے بارے میں اقبال کے اسی طرح کے اشعار جا بجا ملتے ہیں مثلاً

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

یا

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اس طرح کے اشعار سے سطحی طور پر افراد کو گمان گزرتا ہے کہ اقبال عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انہیں تعلیم دلانا قوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے، حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے[۱۴]۔

دین انسانی معاشرے کے لیے اہم ترین بنیادی ضرورت ہے، یہ سیاست کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے فاروقی بنا دیتا ہے، علم کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے نور اور مار کو یار بنا دیتا ہے، بہادری اور مردانگی سے ملتا ہے تو مرحبی اور عنتری کو شجاعتِ حیدری میں بدل دیتا ہے، دولت کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے بخلِ قارونی کے بجائے غنائے عثمانی کا لباس عطا کرتا ہے اور انسانی اخلاق سے ملتا ہے تو اسے ملکوتیت سے بھی بلند تر مقام پر لے جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی معاشرے میں انقلاب معنوی دین ہی کے ذریعے پیدا کیا جا سکتا ہے چونکہ نظامِ تعلیم ہی

وہ عظیم ترین قوت ہے جو معاشرے کے دھارے کا رُخ بدلتی اور اس کی ہیئت کو متشکل اور متصور کرتی ہے اس لیے اس سرچشمۂ قوت میں اعتدال اور توازن کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہ اعتدال اور توازن دین ہی کے ذریعے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نظامِ تعلیم کی بنیاد جب تک دینی افکار کے ذریعے مربوط اور مرصوص نہ کی جائے، معاشرے کی عمارت کبھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتی۔

منطقی طور پر اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں دوسرے عناصر بھی شامل ہیں۔ ان عناصر میں سخت کوشی استغنا تیدِ مقام سے آزادی، خودگری اور خودنگری اہم تر ہیں۔ سخت کوشی کے متعلق ان کے اشعار جا بجا ملتے ہیں اور جہاں بھی وہ نوجوانوں کا ذکر کرتے ہیں، اُن کے پیشِ نظر وہ نوجوان ہوتے ہیں جو سخت کوش ہیں۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر
نیست از نقد و قماش و مال و زر
مالِ اُو فرزندہائے تندرست
تر دماغ و سخت کوش و چابک و چست

لیکن افسوس کہ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں میں انتہائی تن آسانی اور آرام پسندی دیکھتے ہیں اور ان کی اس حالت پر جا بجا آنسو بہاتے ہیں۔

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک از حریر
آرزو در سینۂ اُو زود میر

تن آسانی کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ انسان کے دل میں آرزو مر جاتی ہے، اور جس کے دل میں آرزو مر جائے وہ کبھی زندہ دل اور باحوصلہ نہیں ہو سکتا۔ تن آسانوں کے لیے زندگی ہمیشہ ایک تلخابہ رہتی ہے اور اس تلخابے کو انگبیں میں بدلنے کا نسخہ محض سخت کوشی ہے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جس فلسفۂ خودی کی تبلیغ کی ہے، وہ سخت کوشی ہی کی ایک

ارفع صورت کا نام ہے۔ جب تک کوئی شخص سخت کوش نہ ہوگا وہ اپنی خودی کی نگہبانی نہ کر سکے گا اور انفرادی خودی کی حفاظت نہ ہو سکے تو اجتماعی یا قومی خودی کی حفاظت بھی ناممکن ہے۔

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو
ریزۂ الماس شو، شبنم مشو
پختہ فطرت صورتِ کہسار باش
حاملِ صد ابر دریا بار باش

سخت کوشی اور حفظِ خودی سے قوموں میں قوت اور حصانت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں جو ملت بھی سخت کوش اور اپنی خودی کی نگہبان ہوگی، وہی پائیداری اور ثبات حاصل کرے گی اور جو ملت تن آسان اور آرام پسند ہوگی، وہ نیست و نابود ہو جائے گی۔ سخت کوشی ہی سے انسان میں استغنا کا جوہر پیدا ہوتا ہے اور استغنا کا جوہر اُسے سربلند کرتا اور امتیاز عطا کرتا ہے اس استغنا کی تعریف اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے۔

ز علم چارہ سازے بے گدازے
بسے خوشتر نگاہِ پاک بازے
نکوتر از نگاہِ پاک بازے
دلے از ہر دو عالم بے نیازے

شاعری میں اقبال نے شاہین کا جو نیا سمبل تراشا ہے، وہ بھی حقیقتاً چند اعلیٰ اور ارفع صفات کے اظہار کے لیے ہے۔ شاہین جرأت مند اور سخت کوش ہے، اس کی نگاہ ہمیشہ بلندیوں پر رہتی ہے، وہ آزاد رَو ہے، اسیر مقام نہیں، پابند خانہ و لانہیں، خود دار ہے، مُردہ شکار پر نہیں جھپٹتا، اس کے اندر بے نیازی اور استغنا کی شان پائی جاتی ہے۔ اقبال جب اپنی ملت کے نوجوانوں کو شاہین بچے کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو اس سے اُس کی مراد یہی ہوتی ہے کہ ان نوجوانوں میں وہ تمام صفات پیدا ہو جائیں جو شاہینوں میں پائی جاتی ہیں۔ حیوانات میں جتنی صفات ہوتی ہیں وہ عام طور پر جبلّی ہوتی ہیں لیکن انسان ان کا اکتساب کرتا ہے۔ اکتسابِ صفات کے لیے واضح اور ٹھوس خطوط پر تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ جہاں نمونے تربیت اور تعلیم سے شہباز بن سکتے ہیں وہاں شہباز بھی تعلیم و تربیت نہ ہونے سے نمولوں سے ڈرنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی غلط طور پر تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کے لیے اقبال نے کہا ہے:

تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد
چوں شاہیں زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

اس تمام گفتگو سے ایک نہایت اہم سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے جس کا مختصر سا جواب دیئے بغیر یہ گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی۔ وہ سوال یہ ہے کہ اقبال کے نظریۂ تعلیم کا منتہائے مقصود کیا ہے یعنی وہ کس قسم کے انسان کی تخلیق کا آرزومند ہے۔ اس سوال کا نہایت مختصر اور سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ وہ مردِ مومن کا آرزومند ہے جس کی تعریف اس نے اپنے ان چند اشعار میں کی ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن، نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان

یہ اقبال کے مکمل انسان کی تصویر ہے جو اپنے مکمل انسان میں چار بڑی صفات دیکھنا چاہتا ہے یعنی قہاری، غفاری، قدسی اور جبروت۔ یہ چاروں صفات، صفاتِ الٰہیہ میں سے ہیں گویا ایک مکمل انسان ایک مختصر اور محدود پیمانے پر الوہیانہ صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اس میں اور خدا میں فرق یہی ہے کہ خدا کی ذات میں یہ صفات لامحدودیت کا جامہ پہنے ہوتی ہیں اور انسان کی ذات میں محدود ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ذاتِ خداوندی میں کئی اور صفات ایسی ہیں جو اس کی ذات کے لیے مخصوص ہیں۔ انسان ان صفات کا اکتساب کرنے سے معذور رہے پھر چونکہ خدا قائم بالذات اور قدیم ہے اس لیے اُس کی ذات میں جو صفات ہیں، وہ قدیم اور لازوال ہیں۔ انسان چونکہ حادث ہے اس لیے اُس کی ذات میں جو چند الوہیانہ صفات پیدا ہوں گی وہ بھی حادث اور عارضی ہوں گی۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دنیا کے اکثر بڑے بڑے فلسفیوں نے انسان

کامل کا خواب دیکھا ہے اور اپنی اپنی دانست کے مطابق اسے مختلف نام دیئے ہیں۔ یورپ کے ایک مشہور مفکر نطشے[۵] نے بھی انسانِ کامل کا ایک تصور پیش کیا ہے جسے وہ فوق البشر کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بعض نقادوں نے جن میں سے زیادہ تر مغرب سے تعلق رکھتے ہیں، یہ کہا ہے کہ اقبال نے اپنے انسانِ کامل کا تصور نطشے سے مستعار لیا ہے لیکن انہیں یہ غلط فہمی اس لیے ہوئی ہے کہ مشرق کے فلسفیوں کے افکار اُن تک نہیں پہنچے۔ اقبال اور نطشے کے انسانِ کامل میں ایک بنیادی فرق ہے۔ نطشے کے خیال کے مطابق انسانِ کامل کا جسے وہ فوق البشر کہتا ہے، ظہور ارتقائی عمل کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ گویا وہ زمان و مکان کی انصرافی قوتوں کی پیداوار ہوگا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ فوق البشر کا ظہور اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ زمان و مکان کی انصرافی قوتیں نقطۂ کمال کو نہ پہنچ جائیں۔ اقبال کا انسانِ کامل زمانی اور مکانی قوتوں کی پیداوار نہیں اور نہ اُس کا ظہور کسی خاص وقت یا بعض خاص حالات کا مرہونِ منت ہے بلکہ زمان و مکان خود اس کے پابند ہیں۔ اُس کا ظہور ہر دور میں ممکن ہے بلکہ کامل ترین انسان کا ظہور تو ہو بھی چکا۔ اب جو کامل انسان آئے گا، وہ اُس کامل ترین انسان کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ نطشے کا فوق البشر مادی طاقتوں اور قوتوں کا مظہر ہوگا اس کی قوتیں بے پناہ اور لامحدود ہوں گی۔ ان پر کوئی تحدید نہ ہوگی۔ اقبال کا انسانِ کامل روحانی اور مادی قوتوں کے لطیف امتزاج کا مظہر ہوگا[۶] اور روحانی قوتوں کی باگ اس کی مادی قوتوں کو اعتدال اور توازن کے رستے سے نہ ہٹنے دے گی۔ نطشے کا فوق البشر انسانوں کے لیے باعثِ رحمت بھی ہو سکتا ہے اور باعثِ بربادی و ہلاکت بھی کیونکہ وہ اپنے سے برتر کسی قوت کے سامنے جواب دہ نہیں۔ اقبال کا انسانِ کامل محض رحمت ہی رحمت ہے کیونکہ اُسے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ وہ اپنے ہر فعل اور ہر عمل کے لیے ایک برتر قوت کے سامنے جواب دہ ہے اور یہ برتر قوت دانا، بینا اور دلوں کا حال جاننے والی ہے۔

کتابیات

۱۔ فکرِ اقبال ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
۲۔ نقوشِ اقبال ۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی
۳۔ نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر ۔ اشاعتِ مکرر از ادارۂ نقوش لاہور
۴۔ روحِ اقبال ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان
۵۔ سیرتِ اقبال ۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی
۶۔ آئینۂ اقبال ۔ مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ۔ آئینۂ ادب لاہور
۷۔ السٹریٹڈ ورلڈ انسائیکلو پیڈیا ۔ بویلے پبلشنگ کارپوریشن ۔ نیویارک ۔ یو ایس اے

www.IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

حواشی

۱۔ مغربی علوم وفنون کے اقبال پر اثرات کے سلسلے میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:
"اقبال کو یورپ میں رہنے، حکمتِ فرنگ سے گہرا تعلق پیدا کرنے اور اس کی تہذیب و تمدن کا براہِ راست مشاہدہ کرنے سے طرح طرح کے فائدے پہنچے۔ اقبال کی نظر آغاز ہی سے محققانہ تھی اِس لیے اُس کی زندگی میں مغرب کی کورانہ تقلید کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے یورپ کے سطحی جلووں کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کے باطن پر بھی گہری نگاہ ڈالتا گیا۔ اُس نے فرنگ میں علم وہنر کے کمالات اور انسانی زندگی کی بہبود کے لیے اُن کے مفادات کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس سے بھی آگاہ ہو گیا کہ اس تعمیر میں ایک خرابی کی صورت بھی مضمر ہے۔"

(فکرِ اقبال۔ ص ۶۷)

۲۔ "نقوشِ اقبال" کے عنوان سے ایک کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کے مصنف مولانا سید ابوالحسن ندوی ہیں۔ یہ کتاب ان کی ایک عربی زبان کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

۳۔ سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں۔
"مغربی نظامِ تعلیم درحقیقت مشرقی اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی Genocide کے مرادف تھا۔ عقلائے مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کام کے لیے جا بجا مراکز قائم کیے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا۔

اکبر نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی

اس سے کئی برس بعد، اقبال نے (جنھوں نے اس نظامِ تعلیم کا خود دخم کھایا تھا) اِس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا۔

مباش ایمن ازاں عِلمے کہ خوانی
کہ از وے روحِ قومے می تواں کُشت

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

(نقوشِ اقبال: ص ۸۲، ۸۳)

۴۔ اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کو صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے اغنا اور قلب و روح کی نشوونما، روحانی ارتقاء، اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت کر کے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا ہے جس کے سبب اس کے قویٰ غیر متوازن اور اس کی اٹھان غیر متناسب، موٹی ہے، اور اس کی زندگی ہم آہنگی کے بجائے بے اعتدالیوں کا نمونہ بن گئی ہے۔ نئی نسل کے ظاہر و باطن، عقل و روح، علم و عقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے۔

(نقوشِ اقبال۔ سید ابوالحسن ندوی۔ ص ۸۶)

۵۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں۔

"سید احمد خان ہوں یا اُن کے شرکاءِ کار شبلی، حالی، چراغ علی، نذیر احمد یا مولوی ذکاءاللہ ان سب کو مغربی تہذیب کا روشن پہلو ہی نظر آیا تھا۔ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان اور اس کی کلی سے مرعوب و مغلوب تھے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری

طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون ہی نہیں بلکہ اخلاق کے معیار بھی مغرب ہی سے حاصل کرنے چاہئیں۔ ان میں ہر شخص اپنی تحریروں میں، نثر ہو یا نظم، جب شرق و غرب کا موازنہ کرتا ہے تو نہایت درجہ احساس کمتری کے ساتھ مغرب کی برتری کو تسلیم کرتا ہے۔ دین کے معاملے میں عیسوی عقائد کو چھوڑ کر باقی ہر چیز میں مغرب کی تقلید کو ترقی کا واحد راستہ سمجھتا ہے۔"

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۶۸)

۶۔ مسلمانوں میں قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، چوہدری رحمت علی اور علامہ عنایت اللہ خان المشرقی اور ہندوؤں میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو اس کی روشن مثالیں ہیں۔

۷۔ قیام یورپ نے اقبال کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا اور وہ واقعی یورپی تہذیب کی آگ سے خلیلؑ کی طرح سرخرو ہو کر ابھرے۔ ممتاز حسن لکھتے ہیں۔

"۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ اقبال کے روحانی ارتقا کی اہم ترین منزل ہے اس عرصہ میں اقبال کو تہذیب مغرب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ہی اقبال نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے سلسلہ میں اسلامی فلسفہ اور اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور اُسے تہذیب اسلام اور تہذیب مغرب کے موازنے کا موقع ملا۔ اس موازنے کا اثر یہ تھا کہ اقبال کی زندگی کا عظیم الشان نصب العین یعنی اسلام کے اصولوں کی علم برداری، اُس کے سامنے متعین ہو گیا۔"

(نیرنگ خیال کا اقبال نمبر، اشاعت مکرر، ص ۱۸۳)

۸۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

۹۔ كلمة الحكمة ضالة المومن (ارشادِ نبوی)

۱۰۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ۔ (ارشادِ نبوی)

۱۱۔ ذہنی مرعوبیت کا شکار صرف عام لوگ نہیں ہوتے بلکہ بڑے بڑے قومی رہنما اور صاحبانِ اقتدار بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً رضا شاہ پہلوی نے ملک میں پرانے ایرانی لباس کو ترک کر کے یورپی لباس حکماً رائج کیا۔ ترکی کے عظیم قومی رہنما کمال اتاترک نے بھی یورپی لباس کو حکماً مروج کیا بلکہ طربوش جو ترکوں کی امتیازی ٹوپی تھی، اُسے ختم کر دیا۔ انہوں نے ترکی زبان کا رسم الخط بھی لاطینی کر دیا۔ افغانستان میں امیر امان اللہ خان نے اصلاحات کی آڑ میں عورتوں میں بے پردگی اور مردوں عورتوں کے لیے مغربی لباس مروج کرانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اُنہیں تخت و تاج سے محروم ہونا پڑا۔ اقبال نے اتاترک اور رضا شاہ پہلوی کے طرزِ عمل کی وجہ سے ہی کہا تھا کہ

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

۱۲۔ لفظ عشق کو اقبال نے نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ مجاز و حقیقت دونوں پر حاوی اور خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ عشق سے اقبال کی مراد وہ جوشِ وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیلِ ذات کے لیے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتا ہے۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصہ مستی، انہماک اور جذبِ کل ہے۔

(روحِ اقبال۔ یوسف حسین خان۔ ص ۵۲)

۱۳۔ طلباء علی گڑھ کا ایک وفد دسمبر ۱۹۳۲ء کو علامہ سے ملنے گیا تو علامہ نے ہندوستان کے طریقۂ تعلیم اور اُس کے مُضر اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہماری تعلیم دماغی ترقی کے لیے کوئی ذریعہ مہیا نہیں کرتی اور نہ وسیع النظر بناتی ہے۔ ہر علم کی تعلیم اس قدر ناقص دی جاتی ہے کہ ہم اس علم سے متعارف بھی نہیں ہو سکتے۔ روحانیت کی طرف ترغیب تو کیا ہوتی مذہب ہم سے اور دور ہو جاتا ہے۔" (سیرتِ اقبال۔ ص ۱۳۹)

اقبال مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرے حال ہی میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب بولتا تھا مگر اسلام سے قطعاً بے خبر تھا۔"

(سیرت اقبال از محمد طاہر فاروقی۔ ص ۱۴۷)

۱۴۔ رسالہ مخزن کے ماہ اکتوبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون "قومی زندگی" میں علامہ لکھتے ہیں:

"عمومیات کو چھوڑ کر اگر خصوصیات پر نظر ڈالی جائے تو عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمدن کی جڑ ہے۔ ماں اور بیوی دو ایسے پیارے لفظ ہیں، کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں اگر ماں کی محبت میں حبِ قوم اور حبِ وطن پوشیدہ ہے جس میں سے تمام مذہبی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں تو بیوی کی محبت اُس سوز کا آغاز ہے جس کو عشق الٰہی کہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف خاص توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کی تعلیم دنیا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہلِ مطلق رہ جائے لیکن اس ضمن میں ایک غور طلب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی عورتوں کو مغربی تعلیم کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے وہ اُن کے شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں، قائم رہیں۔ میں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے لیکن چونکہ ابھی ملک کسی قابلِ عمل نتیجے پر نہیں پہنچا، اس واسطے فی الحال اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔"

(آئینہ اقبال۔ مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔ ص ۱۶۷)

۱۵۔ اقبال نئی نسل کی بے ہمتی اور اُس کی اخلاقی پستی کا ذمہ دار موجودہ نظامِ تعلیم کو ٹھہراتے

ہیں جس میں اخلاق پر کوئی توجہ ہے اور نہ تہذیب کا کچھ خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں کے دل سوز دردوں سے خالی اور ان کی نظریں ناپاک ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوان کی زبان بہت تیز ہے لیکن اُس کی آنکھوں میں اشکِ ندامت اور دل میں ذرا بھی خوف وخشیت نہیں۔

جو آنکھ کہ ہے سُرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے، نم ناک نہیں ہے

وہ ان باتوں کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے۔ اور ان کی فطرت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ وہ دوسرا ذمہ دار حد سے بڑھی ہوئی "عقلیت" کو سمجھتے ہیں جو ابوالعزمیوں اور پرخطر راہوں سے روکتی اور ہر قدم پر مصلحت بینی اور عاقبت بینی کا بہانہ تراشتی رہتی ہے

اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی اور اسبابِ طبی اور عہدوں، ملازمتوں اور اونچی کرسیوں کو تعلیم کا مقصد سمجھنا بھی ہے۔

(نقوشِ اقبال۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی ص ۹۰)

۱۶۔ فریڈرک ولہلم نطشے ایک جرمن فلسفی تھا جس کے تصورات نے بہت سے لوگوں کو سخت متاثر کیا ہے۔ وہ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ بڑا طباع تھا اور ابھی ۲۵ برس ہی کا تھا کہ باسل یونیورسٹی میں کلاسیکی ادب کا پروفیسر مقرر ہوا تقریباً دس سال تک اس حیثیت میں کام کرنے کے بعد اُس نے خرابیٔ صحت کی بنا پر ملازمت ترک کر دی۔ ۴۵ سال کی عمر میں وہ ذہنی طور پر بیمار ہو گیا، زندگی کے بقیہ گیارہ سال اُس کی بہن اُس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ ۱۹۰۰ء میں اُس نے وفات پائی۔

نطشے نے لکھا ہے کہ عاجزی اور قربانی کے بارے میں عیسائیوں کے تصورات غلط ہیں۔ ایک حقیقی طور پر بڑا انسان متکبر ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ دوسرے ہر انسان سے برتر ہے۔ ان خیالات کا اظہار اُس نے اپنی کتاب "زرتشت نے کہا" میں کیا ہے۔ اس کتاب میں ہمیں نطشے کے فوق البشر کے متعلق تصورات ملتے ہیں۔ اڈولف ہٹلر کے دور میں جرمنوں نے اس تصور کو اپنا لیا تھا۔

(السٹریٹڈ ورلڈ انسائیکلوپیڈیا۔ ص ۱۱۵۸)

۱۴ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بھی اقبال کو کسی حد تک نطشے سے متاثر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں

"اقبال کو نطشے کی تعلیم کا وہی پہلو پسند ہے جو اسلام کی تعلیم کا ایک امتیازی عنصر ہے۔ اسلام کے اس پہلو سے متاثر ہونے کی وجہ سے اقبال نے نطشے کا اثر قبول کیا۔ اسلام نے جہاد کو ایمان کا ثبوت قرار دیا اور کہا جہاد ہی ملت کی رہبانیت ہے۔ زندگی باوجود اس کی کلفت اور کشاکش کے اسلام کے نزدیک ایک نعمت ہے جس میں قوت اور جمال پیدا کرنا مومن کا فرض ہے۔ اسلام نے فطرت کو صحیح سمجھا اور اپنے آپ کو عین فطرت قرار دیا اور کہا کہ انسان اس فطرت پر خلق کیا گیا ہے ارتقائے حیات، علوِ آدم، تسخیرِ فطرت، احترامِ حیات، جسم اور مادے کو روحانیت کا معاون سمجھنا، حصولِ قوت کی کوشش، یہ تمام چیزیں اسلام اور نطشے کی تعلیم میں بہت حد تک مشترک ہیں گو اندازِ بیان بہت مختلف ہے۔"

(نیرنگِ خیال، اقبال نمبر، اشاعتِ مکرر، ص ۲۴۵)

ہمارے خیال میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اس امر کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ نطشے ایک ذہنی مریض تھا اور اس کے تصورات اس کے مریض ذہن کی پیداوار تھے۔ اقبال ذہنی طور پر نہایت صحت مند تھا اس لیے نطشے کے مریضانہ تصورات سے اس کا اثر قبول کرنا بعید از قیاس ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اسی مقالے میں آگے چل کر کہا ہے۔

"نطشے کی مریدی اقبال نے اس حد تک بھی قبول نہیں کی جس حد تک اس نے مرشدِ رومی کا اتباع کیا ہے۔ نطشے کے افکار میں سے اقبال کو تعمیرِ خودی، استحکامِ خودی اور عروجِ آدم کا مضمون پسند آیا لیکن نطشے کے ہاں سے تخریبی افکار بہ نسبت ترکیبی افکار کے بہت کم ملتے ہیں۔ اس میں جلال کا پہلو جمال کے پہلو پر غالب ہے کہ ہستی محض ایک میدانِ کارزار بن جاتی ہے۔ اقبال خودی کے ساتھ ایک بے خودی کا فلسفہ بھی رکھتا ہے اور ایک کو دوسرے کے بغیر ناقص سمجھتا ہے۔ نطشے کے ہاں انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور مبہم سا رہ جاتا ہے اس کے ہاں قاہری غالب ہے اور دلبری مغلوب۔ اقبال کے نصب العین انسان میں ناز کے ساتھ نیاز بھی ہے۔ ادعا کے ساتھ تسلیم و رضا بھی ہے۔ نطشے جمہوریت اور مساوات

کا دشمن ہے اور غریبوں اور کمزوروں کے لیے نفرت کے احساس کے سوا اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکل کو دھوکا سمجھتا ہے لیکن ایک اعلیٰ سطح پر صحیح مساوات کا متلاشی ہے۔"

(ایضاً۔ ص ۳۲۷)

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

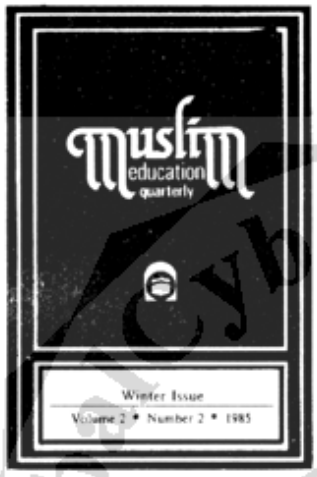

MUSLIM EDUCATION QUARTERLY is a review of Muslim education in the Modern World both in Muslim majority and in Muslim minority countries.

It is intended as a means of communication for scholars dedicated to the task of making education Islamic in character:

(1) by substituting Islamic concepts for secularist concepts of knowledge at present prevalent in all branches of knowledge,

(2) by getting curricula and text books revised or rewritten accordingly and

(3) by proposing concrete strategies for revising teacher-education including teaching methodology.

It is also expected to act as an open forum for exchange of ideas between such thinkers and others including non-Muslims who hold contrary views.

MUSLIM EDUCATION QUARTERLY

Published quarterly in Autumn, Winter, Spring and Summer

Editor: Professor Syed Ali Ashraf

- Contains articles on Islamic education, morality, art, culture, etc.
- Critically evaluates educational issues from the Islamic point of view.
- Contains 'Reminiscences' of contemporary Muslim educationalists.
- Publishes surveys of Muslim education in all countries of the world.
- Publishes book reviews.

SEND YOUR SUBSCRIPTION NOW

To: The Secretary, The Islamic Academy

Please enter my subscription for MUSLIM EDUCATION QUARTERLY.

I enclose a cheque/P.O. for.......................... (make cheque payable to The Islamic Academy. The cheque should be in sterling pounds).

Name ....

Address ....

....

Subscription Rates (including postage): Please indicate your preference.

Private Subscribers ☐ £10.50 per annum

☐ £ 2.65 per issue

Institutions ☐ £13.00 per annum

☐ £ 3.50 per issue

THE ISLAMIC ACADEMY

23 Metcalfe Road, Cambridge, CB4 2DB, U.K. Tel. (0223) 350976

IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006